 

09-10-2017

سب کچھ ٹھیک نہیں ہے

مفتی منیب الرحمٰن

مسلّح افواج ایک منظم ادارہ ہے اوران میں اعلیٰ عہدوں کے لیے سلیکشن کا ایک باقاعدہ نظام ہے، فیصلے محض شخصی پسند وناپسند کی بنا پر نہیں، بلکہ ادارتی سطح پر ہوتے ہیں، یہ دعویٰ تو مبالغہ اور فطرت انسانی سے ماورا ہوگا کہ وہ ذاتی ترجیحات اور فروگزاشتوں سے بالکل پاک ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی صورت حال قابل اطمینان ہے۔ وہ منصب کے لیے درکار معیار کو ملحوظ رکھتے ہیں اور امکانی حدتک پرفیکشن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل ISPR کے عہدے پر میجر جنرل رینک کا افسر ہوتا ہے اور اس کا انتخاب یقیناً سوچ بچار کے بعد ہوتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میڈیا سے اپنی گفتگو میں الفاظ کا چناؤ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور مغلوب الغضب نہیں ہوتے۔ سابق ڈی جی لفٹننٹ جنرل عاصم باجوہ اس سلسلے میں زیادہ ماہر تھے، وہ اپنا تاثر سافٹ رکھتے اور ریلیکس ہوکر گفتگو کرتے تھے۔ ہمارا براہ راست رابطہ نہیں ہے، تاہم جناب جنرل آصف غفور کو مشورہ ہے کہ وہ تناؤ سے آزاد ہوکر تاثر کو بہتر بنائیں۔ سابق آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی تو برف کی سل کی مانند ٹھنڈے ٹھار آدمی تھے، لہٰذا چہرے کے تاثرات سے ان کے دل کی بات جاننا مشکل تھا، ان کے جانشین جنرل راحیل شریف ذرا نمود پسند تھے اور جناب جنرل قمر جاوید باجوہ بَین بَین ہیں، کیونکہ ورثے میں پائی ہوئی روایت کو یک دم چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔

پاک وہند میں کور کمانڈر کہلاتے ہیں، امریکی دنیا پر حکمرانی کے دعویدار ہیں، لہٰذا ان کی کمانڈ خطے پر محیط ہوتی ہے، میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی باوقار ملک میں فوجی کمانڈروں کی میٹنگ کو ہماری طرح میڈیا میں غیر معمولی کوریج دی جاتی ہو۔ بیشتر ممالک میں یہ معمول کا معاملہ ہوتا ہے اور میڈیا کو اس سے باخبر رکھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مسلّح افواج وقفے وقفے سے اقتدار پر فائز رہی ہیں، اس لیے حساسیت زیادہ ہے، میڈیا کی ریٹنگ کے بھی تقاضے ہوتے ہیں، سو وہ چار چار آنکھیں کان لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کہیں سے کھود کرید کر کوئی سنسنی خیز خبر نکالی جائے۔ متن سے یہ خواہش پوری نہ ہو تو پھر ماہرین اور تجزیہ کاروں کی فوج ظفر موج کا میلہ لگ جاتا ہے، بین السطور، حاشیہ اور شرح کا میدان بڑا وسیع ہے۔ میڈیا رپورٹر اندر کی خبر نکالنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہم اس طرح کے دعوے کرنے کا حق نہیں رکھتے، صرف منظر کو دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں، جس میں غلطی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ کبھی دورانِ سفر کسی صاحبِ منصب سے ملاقات ہوجاتی ہے، وہ احترام ومحبت سے اپنا تعارف کرا کے مل لیتے ہیں اور سنجیدہ تبادلۂ خیال بھی ہوجاتا ہے۔ ہم اپنے اپنے طبقات کے بارے میں دیانت داری سے بات کرتے ہیں، لیکن فرمان نبوی کے مطابق ''مجلس کی گفتگو امانت ہوتی ہے''، لہٰذا ایسی باتیں سینے کا دفینہ ہوتی ہیں۔

سو جب سول اور فوجی اداروں میں مؤقف کا اظہار معروف ادارہ جاتی طریقۂ کار سے ہٹ کر میڈیا کے ذریعے ہو رہا ہو تو اس کے معنی ہیں: ''مانا کہ ہمارے ہاں بہت کچھ ٹھیک ہے، لیکن سب کچھ ٹھیک نہیں ہے''، کہیں نہ کہیں چنگاری سلگ رہی ہے اور یہ موجودہ حساس قومی و بین الاقوامی تناظر میں ملک کے مفاد میں نہیں ہے، اختلاف رائے کی صورت میں بھی اظہار معروف طریقہ کار کے مطابق ہونا چاہیے۔ جناب جنرل آصف غفور نے کہا: ''خاموشی کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے''۔ فقہی اصول ہے: ''جب کسی کی رضا مندی معلوم کرنے کے لیے سوال کیا جائے، تو اس پر سکوت رضا مندی کی دلیل ہے''، اس کی مثال یہ ہے: ''کنواری عورت سے سوال کیا جائے کہ آپ کو اتنے مہر کے عوض فلاں شخص سے نکاح قبول ہے، وہ خاموش رہے یا مسکرا دے تو یہ اس کی رضامندی سمجھی جائے گی، کیونکہ حیا زبانی اظہار میں مانع ہے، جبکہ مطلقہ یا بیوہ عورت سے یہی سوال کیا جائے تو اس کا سکوت کافی نہیں ہوگا، بلکہ زبانی اظہار کے لیے کہا جائے گا، کیونکہ وہ اس تجربے سے گزر چکی ہے اور اس کے لیے حیا اقرار یا انکار میں مانع نہیں ہے۔ ہماری رائے میں یہاں بھی شکایات یا غلط فہمی کے ازالے کے لیے طرفین کی رسمی نشست ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک جناب احسن اقبال کو جذباتی انداز اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن بہر حال ایسے موقع پر، کم تر درجے ہی میں سہی، اس کا جواز بنتا ہے۔ دوسری بات جنرل صاحب نے یہ فرمائی: ''رینجرز کی مدد مانگی گئی تھی، ضروری نہیں کہ یہ عمل تحریری ہو'' یعنی زبانی استدعا بھی ہوسکتی ہے۔ یہی اصل مسئلہ ہے کہ جو سول ادارے یا افسران اس کے مُجاز تھے، وہ کسی ایسی تحریری یا زبانی استدعا سے انکاری ہیں۔ وزیر مملکت طلال چوہدری نے کہا کہ ذمے دار کا تعین ہونا چاہیے اور اسے سزا ملنی چاہیے، اداروں کے درمیان تناؤ کے ماحول میں یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ انہیں کہنا چاہیے تھا: ''ان کی سرزنش یا تادیبی کارروائی ہونی چاہیے''، اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ احسن طریقے سے معاملہ نمٹایا جائے۔ حکومتِ وقت کوئی بھی ہو، ریاست وحکومت کا نظام تسلسل کا متقاضی ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ چند سال پہلے کراچی میں ہوا تھا۔ شہدائے کربلا کے چہلم کے دن علی الصباح دارالعلوم کراچی میں چھاپہ مار کارروائی ہوئی، اسے ادارے اور مسلک کے ذمے داران نے اہانت پر محمول کر کے پر زور احتجاج کیا۔ گورنر ہاؤس میں اس وقت کے ڈی جی رینجرز جنرل رضوان اختر نے کہا: ''ہمیں خفیہ اطلاع ملی تھی کہ یہاں کچھ مشتبہ افراد ہیں جو چہلم کے جلوس پر حملے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں''، ہم عجلت میں تھے، پولیس یا دوسرے اداروں سے بھی رابطے کا وقت نہیں تھا، اس لیے فوری ایکشن کرنا پڑا۔ انتظامیہ نے کہا: ''ہمیں اعتماد میں لے لیا ہوتا''، بہر حال انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا، ادارے میں گئے، ذمہ داران سے معذرت کی، معاملہ نمٹ گیا اور باہمی اعتماد واحترام کا رشتہ بھی قائم رہا۔

میں نے گزشتہ ایک کالم میں لکھا تھا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قابل احترام عدلیہ اور ذمے دار اداروں کے درمیان ایک غیر مرئی رابطہ قائم ہوگیا ہے''، چنانچہ ڈی جی صاحب نے جے آئی ٹی میں آئی ایس آئی اور ایم آئی کی شرکت کے حوالے سے کہا: آرمی سے مدد مانگی گئی تھی اور ہم نے آئین کے مطابق اپنی ذمے داری پوری کی''۔ ظاہر ہے ایسی معاونت کے لیے سپریم کورٹ تحریری طور پر وزارت دفاع کے توسط سے رجوع کرتی ہے، جبکہ ایسا نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرمائش بھی براہ راست یا

زبانی کی گئی ہوگی۔ موجودہ ناپسندیدہ حکومت سے قطع نظر یہ رولز آف بزنس کا معاملہ ہے، جس کا میکنزم آنے والے ادوار کے لیے اتفاق رائے سے طے ہونا مناسب ہے۔

ڈی جی صاحب نے سو فیصد درست اور آئیڈیل بات کہی: ''ملک اداروں سے بالا اور ادارے افراد سے بالا ہیں''، لیکن ملک اور ادارے ''اشخاصِ قانونی'' ہوتے ہیں، ساکت ہوتے ہیں اور مُجاز مناصب پر فائز افراد ہی ان کی زبان ہوتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ڈی جی صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں جنرل پرویز مشرف کے سیاسی بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ سیاست دان ہیں، البتہ دفاعی امور پر اپنے تجربے کے مطابق گفتگو کرتے ہیں''، لمحۂ موجود میں جناب جنرل قمر جاوید باجوہ جو بولیں گے، وہی آرمی کی پالیسی ہوگی۔ جسٹس افتخار چوہدری نے منصب پر فائز رہتے ہوئے سب کو لرزاں رکھا، لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے فرمودات کی حیثیت ایک عام شہری یا سیاستدان کی سی ہے اور دانش کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ وہ ماضی کے ہمہ مقتدر جنرل پرویز مشرف کے ناکام سیاسی تجربے سے بھی سبق حاصل نہ کرسکے اور انہی کی طرح خوش فہمیوں سے مخمور ہوکر سیاست کے بحرِ ظلمات میں چھلانگ لگادی اور اب بھولی بسری کہانی ہیں۔ پس جو عزت عہدے کے سبب ملتی ہے، وہ عہدے کے ساتھ ہی رخصت ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ایسی عزت مانگنی چاہیے جو عہدوں کی مرہونِ منت نہ ہو، بلکہ عہدے کے لیے اعزاز وافتخار قرار پائے۔ قومی اسمبلی میں حکمراں جماعت کے بعض ارکان کے واک آؤٹ اور چوہدری نثار علی خان کے ارد گرد ہالہ بننے سے پارٹی میں دراڑ پڑنے کا غیبی اشارہ تو دیدیا گیا ہے، بات نوشتۂ دیوار سے آگے نکل کر عمل کے دائرے میں داخل ہوگئی ہے، اشارات واضح ہیں۔ مقتدرہ کی جانب سے کنونشن لیگ، آئی جے آئی، ق لیگ، پیٹریاٹ اور حریصانِ اقتدار کے مختلف قسم کے فارورڈ گروپ بنانے کے تجربات تو ہمیشہ ہوتے رہے، وقتی طور پر کامیاب بھی رہے، جب تک اقتدار قائم رہا ان کا سکہ چلتا رہا، لیکن کوئی شخص مجسّم خیر ہو یا مجسّم شر، عوام کے دلوں میں درجۂ قبولیت اللہ کی تقدیر سے نصیب ہوتا ہے اور وہ اپنی حکمتوں کو بہتر جانتا ہے۔ لیبارٹری میں تیار کردہ قیادتوں کی لمبی فہرست ہے، جو قصۂ ماضی بن گئے۔ لاہور اور اسلام آباد میں بیٹھے دانشوروں کو کون سمجھائے کہ تمام تر خرابیوں کے باوجود اب تک الطاف حسین کا فیکٹر موجود ہے، 2018ء سر پر ہے، لیکن مقتدرہ کی حکمتِ عملی کسی کو نہیں معلوم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''(جنّات نے کہا:) اور ہم نے آسمان کی (خبروں کی) ٹوہ لگائی، تو ہم نے اسے پہریداروں اور آگ کے گولوں سے بھرا ہوا پایا اور اس سے پہلے ہم (عالَم بالا کی) سُن گُن لینے کے لیے گھات لگا کر بیٹھتے تھے، سو اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے (پیچھے) آگ کے گولے تیار پاتا ہے، (الجن: 9)''۔ شیاطین اِن مسروقہ خبروں کے ٹوٹے کاہنوں تک پہنچاتے تھے اور وہ اس میں اپنا حصہ ڈال کر غیب فروشی کا کاروبار چلاتے تھے۔ شیخ صاحب 2008ء سے غیبی بشارتوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، کبھی ٹائمنگ کے بارے میں ان کے تخمینے غلط ہوجاتے ہیں تو لوگ بلاوجہ مذاق اڑاتے ہیں۔ آخر بشارت فروشی کے لیے انہیں بھی مرچ مصالحہ لگانے کی گنجائش ملنی چاہیے، ان کا یہ خداداد فن ہی تو ہے کہ میڈیا میں رونق افروز بہت سے اینکرز کی روزی میں برکت کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔ بشارات کا ہدف بننے والوں کو اب سمجھ آرہا ہوگا کہ شیخ صاحب کی معلومات اگر سو فیصد درست نہیں تو بالکل غلط بھی نہیں ہوتیں۔

(روزنامہ دنیا، 09 اکتوبر 2017ء)